اللہ تعالیٰ کے پیار کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ بغض وعداوت کو اپنے قریب نہ آنے دو

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۵؍نومبر ۱۹۷۴ء بمقام مسجد اقصیٰ ربوہ)

تشہّد وتعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور انور نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:-

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۞ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۞ (الاعراف:۵۶-۵۷)

پھر حضور انور نے فرمایا۔

پہلے تو مَیں اپنے دوستوں کو اِس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ عملِ صالح کے معنے موقع ومحل پر عمل کرنے کے ہوتے ہیں۔ غلط جگہ پر صحیح کام بھی اسلام میں پسندیدہ نہیں اِس لئے موقع اور محل کے مطابق کام کرنے کا حکم ہے مقام بھی صحیح ہونا چاہیئے اور کام بھی صحیح ہونا چاہیئے۔ اگر کسی دوست نے مجھے کوئی خط دینا ہو تو اس کے لئے صحیح جگہ میرا دفتر ہے مسجد اقصیٰ نہیں ہے، بہرحال دوستوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اعمالِ صالحہ بجا لاؤ یعنی ایسی نیکیاں بجالانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے جو موقع اور محل کے مطابق ہوں۔ اس حکم کو ہمیشہ مدِّنظر رکھنا چاہیئے اور اس کے مطابق اعمال بجالانے چاہئیں تا کہ ثواب حاصل ہو۔

ایک سلسلہ مضامین پر مَیں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں، یہ سلسلہ اِس وجہ سے

شروع ہوا کہ نیشنل اسمبلی نے ایک فیصلہ کیا اور مَیں نے بتایا تھا کہ جہاں تک اس پر تبصرہ کا سوال ہے مَیں جنوری یا فروری کو اس پر تبصرہ کروں گا لیکن جہاں تک ردِّعمل کا سوال ہے، مَیں یہ بتا رہا ہوں کہ ہم قرآنی شریعت کو شریعت حقّہ سمجھتے ہیں اور اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم نے قُربِ الٰہی اور رضائے الٰہی کے لئے جو راہیں متعیّن کی ہیں ہم اُن پر چلنا ضروری سمجھتے ہیں بلکہ ان پر چلنے میں اپنی خوشحالی اور کامیابی کا راز سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم نے ہمیں بُنیادی طور پر دو قِسم کی باتیں بتائی ہیں۔ ایک وہ جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے اور اُن سے بچنا ضروری ہے دوسرے وہ احکام ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ ان کے بجالانے سے اللہ تعالیٰ کا پیار، اس کی محبت اور اس کی رضا ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ بعض خطبات میں مَیں نے ایک پہلو کے متعلق بات کی اور بعض میں دوسرے پہلو کے متعلق بات کی۔ آج مَیں ایک اور ایسی بات بیان کرنا چاہتا ہوں جس کے متعلق قرآن کریم بتاتا ہے کہ اس کے کرنے سے اللہ تعالیٰ انسان سے خوش نہیں ہوتا وہ اس سے پیار نہیں کرتا۔ انسان رضائے الٰہی کو حاصل نہیں کرسکتا اور وہ ہے اعتداء یعنی حد سے بڑھنا۔

مَیں نے سورۂ اعراف کی جو آیات ابھی پڑھی ہیں اُن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے ربّ کو پُکارو۔ اُس سے دُعائیں کرو۔ گڑگڑا کر بھی اور چپکے چپکے بھی، اجتماعی طور پر بھی دُعائیں کرو اور انفرادی طور پر بھی اور اُس سے یہ دُعا مانگو کہ اے اللہ تو ہمارا ربّ ہے۔ تُو نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری پیدائش کو احسن بنایا ہے تُو نے ہمیں ہماری ضرورت کے مطابق قوّتیں عطا کیں اور ان قوتوں کی نشو ونما کے سامان پیدا کئے ہیں۔ گویا ہمارے قویٰ میں درجہ بدرجہ ترقیات عطا کر کے خدا تعالیٰ ہمیں بلندیوں اور کامیابیوں کی طرف لے جانے والا ہے۔ اسی غرض کے لئے اُس نے شریعتِ حقّہ کو قرآن کریم کی شکل میں نازل فرمایا۔ اِس لئے اس سے دُعا کرو کہ وہ ہمیں یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم اُن حدود کے اندر رہ کر اور اُن حقوق کو ادا کر کے جو اُس نے مقرر کئے ہیں اپنی ربوبیّت اور نشو ونما کے سامان پیدا کریں اور یہ دُعا گڑگڑا کر بھی کرو اور خُفیہ بھی، اجتماعی طور پر بھی کرو اور انفرادی طور پر بھی اور یہ یاد رکھو کہ جب تک اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے اُس کے فضل کو جذب نہیں کیا جاتا، انسان حقوق کے دائرہ

میں نہیں رہتا، وہ اُن کو پامال کرتا ہے۔ جو شخص حقوق کو پامال کرتا ہے اُس کے متعلق فرمایا:- اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ اللہ تعالیٰ اعتداء کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ان سے پیار اور محبت نہیں کرتا۔ اعتداء کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا انسان کو حاصل نہیں ہوتی اس سے اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا دینِ حق کے نزول کے بعد، حقوق کی تعیین کے بعد، حقوق کی وضاحت کے بعد اور اللہ تعالیٰ کے اس اعلان کے بعد کہ حقوق کی ادائیگی کے لئے مادی اور غیر مادی سامان پیدا کئے گئے ہیں اور ان کی تقسیم ان اصول پر ہونی چاہیئے جن کے نتیجہ میں اس دنیا میں اصلاح کے حالات پیدا ہوتے ہیں اور فساد کے حالات مٹ جاتے ہیں، امن کے حالات پیدا ہوتے ہیں اور خوف کے حالات دور کر دیئے جاتے ہیں۔ ان حالات کے پیدا ہونے کے بعد لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ کی رو سے اس زمین میں جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایک نیا روپ لے کر دُنیا کے سامنے آئی ہے۔ اس میں فساد کے حالات پیدا نہ کرو۔ پھر تاکیداً فرمایا کہ وَادْعُوْهُ کہ خدا تعالیٰ سے عاجزانہ دُعائیں کر کے اس کی برکتوں اور رحمتوں کو حاصل کرو اور اس کی نُصرت اور مدد پاؤ تا کہ تم خَوْفًا اس خوف سے نجات پاؤ جو حق تلفی کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے وَّطَمَعًا اور اس رَجاء اور امید کے ساتھ دُعائیں کرو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تمہیں حقوق کی ادائیگی کے دائرہ میں رکھ کر خدا تعالیٰ کے پیار کو پانے والا بنادے۔ فرمایا اگر تم محسن بنو۔ اگر تم ہمارے احکام کو تمام بیان کردہ شرائط کے ساتھ بجا لاؤ تو یاد رکھو کہ تم خدا تعالیٰ کی رحمت کو اپنے قریب پاؤ گے۔

پس آج کا میرا مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اعتداء کو پسند نہیں کرتا انسان اعتداء کے بعد (جس کے معنے مَیں ابھی بتاتا ہوں) خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

عربی کے لفظ عدو (عَ۔دَ۔وَ) کے مختلف معانی ہیں اور قریباً سارے معانی کا عکس اور اُن کی جھلک اعتداء میں آجاتی ہے۔ اِعْتَدَوْا کے معنے ہیں حق سے تجاوز کرنا۔ گو لُغت میں یہ لفظ تین طرح بیان ہوا ہے لیکن مَیں اس وقت صرف دو کو لوں گا۔ حد سے تجاوز کرنے

کے ایک معنے یہ ہوتے ہیں کہ حق تو نہیں ہوتا۔ مگر اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ حق سے تجاوز کرنے کے ایک معنی یہ ہیں کہ دوسرے کا حق ہوتا ہے مگر اسے دینے سے انکار کیا جاتا ہے گویا اپنے لئے یا غیر کے لئے۔ اپنے دوست کے لئے یا اپنے عزیز کے لئے۔ اپنے ہم خیال کے لئے، اپنے ہم عقیدہ کے لئے اُن حقوق کا مطالبہ کرنا جنہیں اللہ تعالیٰ نے قائم نہیں کیا یہ حق سے تجاوز کرنا ہے۔ دوسری طرف اُن حقوق کو جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذات اور اُس کے عزیزوں کے لئے قائم کیا۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہمسایوں کے لئے قائم کیا۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہم عقیدہ لوگوں کے لئے قائم کیا۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے مخالفوں کے لئے قائم کیا گویا وہ حقوق جو خدا کے قائم کردہ ہیں، اُن کو ادا نہ کرنا اور ان کی ادائیگی میں روک بننا، یہ بھی حد سے تجاوز کرنا ہے اور اس وجہ سے جب دوسرے کی حق تلفی کے معنی میں یہ تجاوز ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں ظلم اور دشمنی کے ساتھ اور بُغض سے دوسرے کو ایذاء پہنچانا۔ یعنی دشمنی اور بُغض کی وجہ سے کسی کو دُکھ دینے کی خواہش رکھنا اور دُکھ پہنچانے کے لئے کوشش کرنا اعتداء ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص حق سے تجاوز کرے گا اور حق تلفی کرے گا اور دشمنی اور بُغض کے نتیجہ میں دُکھ پہنچانے کی کوشش کرے گا تو خدا تعالیٰ اُس سے پیار نہیں کرے گا اور یہ ایک زبردست اعلان ہے جو ان آیات میں کیا گیا ہے۔

ان آیات سے جو مطلب ہم اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اجتماعی اور انفرادی دعاؤں کے ساتھ جب تک ہم اپنے پیدا کرنے والے رب کریم کو مدد کے لئے نہ پُکاریں اُس وقت تک ہم اُن حدود میں جو خدا تعالیٰ نے قائم کی ہیں، رہ نہیں سکتے یعنی اپنی حدود میں رہنے کے لئے دعاؤں کی ضرورت ہے۔ آج کی اندھی دُنیا دعاؤں پر زور دینے کی بجائے اپنی عقل پر فخر کرتی ہے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ اللہ کے قائم کردہ دائرہ حدود میں رہنے کے لئے تمہیں عقل کی ضرورت تھی اور وہ تمہیں ہم نے عطا کر دی۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ حقوق کی ادائیگی کے لئے خدا تعالیٰ کے قائم کردہ حقوق کے حصول کے لئے اعمال تم بجالاتے ہو اس میں تم کامیاب تبھی ہو سکتے ہو، جب دعائیں کرو، ٹھیک ہے عقل بھی ایک عطاء الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے لیکن عقل اسی وقت صحیح کام کر سکتی ہے جب اُسے خدا تعالیٰ کی ہدایت اور تعلیم اور

وحی کی روشنی حاصل ہو۔ الٰہی نُور کے بغیر عقل کو وہ روشنی نہیں ملتی جو عقل کو صحیح راستوں پر چلا سکے اور کامیابیوں تک عقل مندوں کو لے جا سکے۔

اس سے ایک تو ہمیں یہ پتہ لگا کہ اپنے حقوق لینے ہوں تو بھی دوسروں کے لئے سکھ پیدا کرنے ہوں گے اور دُکھوں سے بچانا ہو تو بھی دعاؤں کی ضرورت ہے نہ کہ کسی اَور چیز کی کیونکہ جب تک عاجزانہ دعاؤں کے ساتھ اور جب تک اجتماعی اور انفرادی دعاؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو انسان جذب نہیں کرتا، اُس وقت تک وہ حق کے دائرہ کے اندر نہیں رہ سکتا۔ نہ اپنے حقوق کے حصول کے لئے اس کی کوششیں جائز ہوں گی نہ دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے لئے اس کے اندر ایک جذبہ اور جوش پیدا ہوگا۔

دوسری بات ہمیں یہ بتائی گئی ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنے حقوق کے دائرہ میں نہیں رہتا اور زیادتی کرتا ہے اور تجاوز کرتا ہے اور حق تلفی کرتا ہے اور دشمنی اور بُغض سے دوسرے کو ایذاء پہنچاتا ہے اور اپنے لئے وہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کا حق نہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پیار کو کھو بیٹھتا ہے۔

اس ضمن میں ہمیں دُنیا میں دو قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو عادتاً دوسروں کو سُکھ پہنچانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو اپنی بدقسمتی سے دوسروں کو دُکھ پہنچانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کم و بیش دنیا کے ہر خِطّہ میں نظر آتی ہے۔ اس وقت دنیاوی لحاظ سے جو ترقی یافتہ ممالک ہیں انہوں نے جو ترقی کی ہے اُس کا راز بھی یہی ہے کہ انہوں نے اس حقیقت کو پہچانا کہ دوسروں کو سُکھ پہنچانے کے نتیجہ میں اور اُن کے دُکھ دور کرنے کی وجہ سے قومیں ترقی کیا کرتی ہیں۔

مَیں نے کئی ایسے واقعات پڑھے ہیں مثلاً انگریز قوم کو ایک وقت میں برطانوی سلطنت پر بڑا ناز تھا۔ دُنیا میں انگریزوں کی طاقت پھیلی ہوئی تھی۔ دُنیا کے ایک بڑے علاقے کو انہوں نے اپنے ماتحت کر رکھا تھا چنانچہ اگر سنگا پور یا ملائشیا یا کسی اَور دور دراز علاقے میں کسی انگریز کی دس ہزار پاؤنڈ کی حق تلفی ہوتی یعنی کوئی شخص کسی انگریز کے دس ہزار پاؤنڈ مار لیتا تو برطانوی حکومت اس دس ہزار پاؤنڈ کے حق کی ادائیگی کے لئے تیار ہو جاتی تھی اور پُورا زور لگاتی تھی اور

اپنی طاقت کے بَل پر اُس کو دس ہزار پونڈ دلواتی تھی چاہے اس کے اوپر اُسے کتنا بھی خرچ کیوں نہ کرنا پڑے گویا فردِ واحد کو ذہنی، جسمانی اور دُنیاوی حقوق کے لحاظ سے دس ہزار پاؤنڈ کے ضیاع سے جو دُکھ پہنچا تھا، اس کو دُور کرنے کے لئے ساری ایمپائر (Empire) متوجہ ہو جاتی تھی۔ وہ یہ نہیں کہتی تھی کہ اتنی بڑی ہماری سلطنت ہے اور اتنی دولت ہمارے پاس جمع ہو چکی ہے ایک آدمی کے دس ہزار پاؤنڈ ضائع ہو گئے تو کیا بات ہے۔ اس لئے کہ جو قوم اور مملکت اپنے شہریوں کو حقوق دلانے کے لئے ہر وقت چوکس اور بیدار نہیں رہتی وہ قوم اس دُنیا میں ترقی نہیں کر سکتی، یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے کوئی عقل مند انکار نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کے باوجود استثنائی طور ہمیں انگریزوں میں سے ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو دوسروں کو ایذاء پہنچا کر اور دُکھ دے کر خوشی اور مسرت حاصل کرتے ہیں۔ اب تو اُن کی حالت بدل گئی ہے لیکن کسی وقت میں اُن کی بہت بڑی سلطنت تھی جس کے متعلق اُن کا یہ دعویٰ تھا کہ اُس پر سورج غروب نہیں ہوتا۔ (اب تو غروب ہونے لگ گیا ہے) تا ہم غروب ہوتا ہے یا نہیں، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں دراصل دیکھنے والی بات یہ ہے کہ انہوں نے جو ترقی کی ہے اس کے لئے انہوں نے کن اصولوں کو اپنایا تھا نیز ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ قوم کے دکھوں کو اور افراد کے دُکھوں کو دور کرنے میں قوم کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے کہ کچھ لوگ دُنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کو دُکھ پہنچا کر خوشی اور مسرّت محسوس کرتے ہیں یعنی بگڑی ہوئی فطرت غلط رنگ میں دُنیا کے سامنے اپنی طاقت اور کوشش کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جو قومیں ترقی یافتہ نہیں، اُن میں ہمیں یہی دو قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جن کو اس راز کا علم نہیں ہے اور وہ اپنے ہی بھائی بند کو دُکھ پہنچانے میں خوشی اور مسرّت محسوس کرتے ہیں گویا وہ اپنی خوشی اور مسرّت کے حصول کے لئے دوسروں کو دُکھ پہنچاتے ہیں لیکن ان کا ایک حصّہ ایسا بھی ہوتا ہے جس کی یہ ذہنیت نہیں ہوتی وہ ملک میں رہنے والے ہر شہری کو سُکھ پہنچانے کی کوشش کرتے اور دُکھوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غیر ترقی یافتہ اور ترقی کی خواہش رکھنے والی اقوام میں مختلف نسبتوں کے ساتھ یہ ذہنیت ہمیں نظر آتی ہے۔

اس تمہید کے بعد مَیں اپنے ملک کی طرف آتا ہوں۔ ہمارے ملک میں یہ گندی ذہنیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے اور اس میں صرف احمدیت کا تعصّب نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی آپ کو کوئی دُکھ پہنچانے والا ملتا ہے وہ عام شہری ہے یا حکومت کا کوئی کارندہ، اسے دیکھ کر آپ یہ نہ سمجھ لیا کریں کہ وہ صرف احمدیت کی وجہ سے آپ کو دُکھ پہنچا رہا ہے۔ ہمارے اس ملک میں کثرت کے ساتھ وہ لوگ بھی ہیں جو ایک دوسرے کو دُکھ پہنچانے میں مصروف ہیں مثلاً سُنّی سُنّی کو دُکھ پہنچا رہا ہے اور شیعہ شیعہ کو دُکھ پہنچا رہا ہے اور اپنے ہی گھر والا اپنے بھائی کو دُکھ پہنچا رہا ہے۔کیا آپ اخباروں میں بھائیوں کی آپس میں لڑائیوں کے متعلق پڑھتے نہیں؟ تو وہاں تو عقیدہ کے اختلاف کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے ایک ماں باپ کی اولاد لیکن اُن کی ذہنیت ایسی ہے کہ ہر بھائی دوسرے کو دُکھ پہنچانے میں لذّت اور سرور محسوس کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اس قسم کی ذہنیت والے لوگ حکومت کے نوکر اور عوام کے خادموں میں بھی ہیں لیکن ان کی کثرت نہیں ہونی چاہیئے۔ استثنائی طور پر تو جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے انگریز کے زمانہ میں بھی جب برٹش ایمپائر پر سورج غروب نہیں ہوا کرتا تھا شاید لاکھوں میں ایک آدمی اُن میں بھی ہو جو اذّیت پسند ہو لیکن جب قوم میں کثرت اس ذہنیت کے لوگوں کی ہو جائے کہ کسی کو سُکھ نہیں پہنچانا، دوسروں کو دُکھ پہنچانا ہے اور دُکھوں کو دُور نہیں کرنا اور اگر کسی کو سکھ پہنچا ہوا ہو اور وہ چین سے زندگی بسر کر رہا ہو تو اس کو اس سے محروم کرنے کی کوشش کرنی ہے تو پھر قوم ترقی کر ہی نہیں سکتی اس لئے کہ مملکت کے شہریوں کے مجموعہ سے مملکت اور ملک بنتا ہے۔ مثلاً اگر ہر فرد کو ایک ایک کر کے اور چُن چُن کر غریب بنا دیا جائے تو سارا ملک غریب ہو جائے گا۔ اگر ایک ایک آدمی کو پڑھائی سے اور علم سے محروم کر دیا جائے تو وہ جاہلوں کی قوم بن جائے گی لیکن اگر انفرادی طور پر ہر فرد کو علم سکھایا جائے اس کی علمی ترقی کے لئے کوشش کی جائے۔ اگر وہ روزی کمانے کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو اس میں اس کی مدد کی جائے، حصولِ رزق کے لئے اس کی رہنمائی کی جائے، ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ اس کی کوششیں بار آور ہوں اور وہ امیر بن جائے۔ اگر ہر فرد امیر ہو جائے تو گویا ملک امیر بن جائے گا۔ اگر پچاس فی صد لوگ امیر ہوں اور پچاس فی صد غریب ہوں تو وہ ملک درمیانہ

درجہ کا ہوتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے وہ کوئی دولت مند ملک نہیں کہلائے گا۔ اسی لئے جمہوریت کی یہ تعریف کی گئی ہے۔ (طالب علمی کے زمانہ میں یہ میرا مضمون رہا ہے) کہ جمہوریت کچھ اس قسم کی حکومت ہے کہ جس میں (One for all and all for one) کا اصول کارفرما ہوتا ہے یعنی ہر فرد قوم کی خاطر زندگی گزار رہا ہوتا ہے اور ساری قوم اُس ایک فرد کے لئے زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔ یہ ہے جمہوریت کی صحیح تعریف. بڑے بڑے ماہرین سیاست نے اپنی فلسفیانہ بحثوں میں یہ کہا ہے کہ فردِ واحد یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں سب کے لئے قربانی دے کر بہت سی باتوں سے محروم ہو جاؤں گا اس لئے کہ ’’ایک سب کے لئے اور سب اُس ایک کے لئے‘‘ کے اصول کی رُو سے فرض کرو کسی ملک کی آبادی چھ کروڑ ہے تو اگر ایک شخص چھ کروڑ کے لئے قربانی دے رہا ہے تو اس کو اس لئے نقصان نہیں کہ چھ کروڑ اُس ایک کے لئے قربانی دے رہے ہوں گے اور اس کو بہر حال فائدہ ہے کیونکہ اُس ایک نے جو کچھ قوم کی خاطر کھو دیا اور چھ کروڑ سے کچھ حاصل کر لیا۔ پس اس ایک نے جو کچھ کھویا اس کے مقابلہ میں چھ کروڑ سے جو حاصل کیا وہ بہرحال زیادہ ہے۔ وہ عقلاً بھی زیادہ ہے اور عملاً بھی زیادہ ہے۔ جمہوریت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چھ کروڑ میں سے پانچ کروڑ نوے لاکھ کی اکثریت دس لاکھ کو کھا جائے اور کہے کہ جو اکثریت ہے وہ اقلیّت کو دُکھ ہی پہنچایا کرتی ہے اور کھا ہی لیا کرتی ہے، یہ جمہوریت نہیں۔ یہ ایذا دہی ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے:۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ جب قوم کی اکثریت اعتداء کے گناہ میں ملوّث ہو جائے اور اکثریت ایک دوسرے کو دُکھ پہنچانے لگے اور اعتقاد اعتقاد کا فرق، قوم قوم کا فرق، خاندان خاندان کا فرق، علاقے علاقے کا فرق اور خطّے خطّے کا فرق ہونے لگے اور ایذا دہی کی بنیاد بنے تو اس قسم کا تعصّب اور اس قسم کی ذہنیت جس کا مقصد ایک دوسرے کو ایذا اور نقصان پہنچانا ہوتا ہے، ملک وملّت کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ایسی ذہنیت اعتقادات کی حدود کو پھاند کر بہت آگے نکل جاتی ہے۔ ملک کی اکثریت یا ایک بڑے بھاری حصّہ میں جب یہ ذہنیت پیدا ہو جائے تو قوم کی ہلاکت کے سامان تو پیدا ہو سکتے ہیں قوم کی نجات اور اس کی فلاح اور ترقیات کے سامان نہیں پیدا ہو سکتے کیونکہ کوئی قوم دین و دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی

جب تک دینی معاملات میں خدا تعالیٰ کے پیار کو اور دنیوی معاملات میں خدا تعالیٰ کی مدد کو حاصل نہ کرے، ہمارا اللہ صرف رحیم نہیں جو مومن کو اُس کے اعمال کا بہترین پھل عطا کرتا ہے۔ ہمارا اللہ ربّ بھی ہے جو مومن و کافر کی بھلائی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ جو لوگ اُس کو گالیاں دینے والے ہیں انہیں بھی وہ بُھوکا نہیں مارتا۔ دُنیوی لحاظ سے ان کی ترقیات کے راستہ میں فرشتوں کی فوجیں کبھی حائل نہیں ہوتیں۔ ان کو ترقی کی اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا غضب صرف اس لئے نہیں بھڑکتا کہ ان لوگوں نے اپنے ربّ کو پہچانا نہیں بلکہ جس وقت اس کی مخلوق اور اس کا پیدا کردہ انسان ظلم کی انتہا کو پہنچتا ہے تو اپنے دوسرے بندوں کو ان ناسمجھ انسانوں کے ظلم سے اور اُن کے اعتداء سے بچانے کے لئے اُس کا قہر بھڑکا کرتا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَیۡءٍ (الاعراف:۱۵۷) ویسے قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ جن لوگوں کی ساری توجہ اور کوشش اور اعمال دُنیا کے لئے ہو گئے خدا نے اُن کو دُنیا دے دی کیونکہ دینی عقائد کی رُو سے اعمال صالحہ بجالانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے پیار اور اُس سے محبت رکھنے کے اور اس کی راہ میں قربانیاں دینے کے نتائج اور ثواب اگلی دُنیا میں ملتے ہیں۔ یہاں اِس دُنیا میں تو اعمال کے نتائج اور ثواب کی ایک چھوٹی سی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کا تعلق اُن اعمال کے ساتھ ہے جو دین کی حالت میں انسان بجالاتا ہے یا جو خدا کی راہ میں اُس کی رضا حاصل کرنے کے لئے انسان کچھ پیش کرتا ہے اپنے مال سے، اپنے وقت سے اور اپنے سُکھ اور آرام کو چھوڑ دینے سے، جو اس کی جزا انسان کو مرنے کے بعد ملتی ہے، وہ جنّت ہے جہاں خدا تعالیٰ کا پیار ایسے رنگ میں سامنے آجائے گا کہ انسان حقیقی مسّرت اور خوشی سے سرشار ہو جائے گا۔ ہم سب اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے فضل سے ہم سب کے لئے حقیقی خوشی کے سامان پیدا کرے گا۔

بہرحال اِس وقت ہماری آنکھ وہ چیز دیکھ نہیں سکتی جو اُخروی زندگی میں خدا رسیدہ انسان کے لئے مقدّر رہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بڑی وضاحت سے اِس مضمون کو

بیان فرمایا ہے۔ یہ ایک علیحدہ مضمون ہے ۔ اِس وقت مَیں بتا یہ رہا ہوں کہ خدا تعالیٰ اِس دنیا میں صرف مومن ہی کو اُس کے دین اور دُنیوی اعمال کی وجہ سے جزا نہیں دیتا بلکہ جو لوگ مومن نہیں اُن کے جو اعمال ہیں اُن کا بھی نتیجہ ربّ ہونے کے لحاظ سے اور رحمٰن ہونے کے لحاظ سے نکالتا ہے یعنی وہ کوششیں ابھی اُن کی شروع بھی نہیں ہوئی تھیں کہ اُن کی کامیابی کے سامان اُس نے پیدا کر دیئے تھے اور درجہ بدرجہ اُن کو دُنیوی کامیابیوں کی طرف دُنیوی کوششوں کے نتیجہ میں لے جا رہا ہے۔

پس جس مُلک میں خدا تعالیٰ کی منشاء کے خلاف دُکھ پہنچانے کی ذہنیت زیادہ ہو جائے وہ قوم ترقی نہیں کیا کرتی اور خدا کو نہ پہچاننے والے اور اس کا عرفان نہ رکھنے والے بھی اگر اِس اصول کو سمجھنے لگیں، خواہ وہ یہ نہ بھی سمجھیں کہ خدا نے یہ اصول قائم کئے ہیں، لیکن اِس اصول کو سمجھنے لگیں کہ دُنیوی ترقیات کے لئے اجتماعی کوششیں ضروری ہیں تا کہ ہر فرد کے دُکھوں کو دُور کیا جائے تب ہی ملک کی حالت سُدھر سکتی ہے کیونکہ اگر ہر فرد دُکھی ہوگا تو وہ قوم خوشحال کیسے ہوگی، اُس کے چہروں پر مسکراہٹیں کیسے آئیں گی۔ یہ تو الٰہی جماعتوں کی استثنائی حالت ہے کہ دُنیا والے سمجھتے ہیں کہ ہم اُنہیں دُکھ پہنچا رہے ہیں مگر ان کے چہروں پر اسی طرح مسکراہٹیں ہوتی ہیں جس طرح پہلے تھیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ الٰہی سلسلوں کی مسکراہٹوں کا سر چشمہ خدا تعالیٰ کا پیار اور اُس کی رحمت ہوتی ہے۔ کوئی دنیوی وجہ اُن کی مسکراہٹوں کی نہیں ہوتی اس لئے دُنیا اُن کی مسکراہٹیں نہیں چھین سکتی۔ خدا تعالیٰ کا پیار اُن کی مسکراہٹوں کا منبع ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کے پیار کو دُنیا کی کوئی طاقت اُن سے چھین نہیں سکتی۔ دُنیا سمجھتی ہے کہ اُس نے اُنہیں عذاب میں مبتلا کیا مگر اُن کے دل خدا تعالیٰ کے پیار سے اس طرح بھرے ہوتے ہیں کہ اُن کے رُوئیں رُوئیں سے اُس کی لذت اور سرور پھُوٹ پھُوٹ کر باہر نکل رہا ہوتا ہے۔

پس اِن دو آیات کی تفسیر سے مَیں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ دُنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جو دوسروں کو دُکھ دینے میں لذّت محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی ہدایت کے سامان پیدا کرے اور قوم کو ایسی ذہنیت سے محفوظ رکھے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ہر غیر کو بھی سُکھ پہنچانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اپنا ہے یا بیگانہ بلکہ ہر

ایک کو سُکھ پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے کسی احمدی کو یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ سُکھ پہنچانے کے لئے کسی احمدی کی تلاش کی جائے بلکہ اُسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اُسے سُکھ پہنچانے کے لئے کسی انسان یا کسی حیوان یا کسی حِس رکھنے والی مخلوق کی ضرورت ہے۔ دُنیا سے دُکھ کو دُور کرنا اُس کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ اگر اس نے خدا تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا ہے تو اُسے یہ طریق اختیار کرنا پڑے گا کیونکہ اگر وہ دُنیا میں دُکھ پیدا کرنے کا موجب بنے گا تو خدا تعالیٰ کی رحمت اور اُس کے پیار سے اور اس کی محبت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

تیسری بات ہمیں اِن آیات سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن عظیم ایک عظیم شریعت ہے اس نے مخلوق کے حقوق قائم کئے اور اصلاح کے سامان پیدا کئے۔ اسی لئے فرمایا بَعْدَ اِصْلَاحِهَا۔ تو اصلاح کے سامان خود قرآن کریم نے پیدا کئے ہیں۔ گویا ہر انسان کے حقوق کی اور حیوانات کے حقوق کی اور نباتات کے حقوق کی اور جمادات کے حقوق کی یعنی ہر مخلوق کے حقوق کی تعیین قرآنِ عظیم میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اس عالمین میں اصلاح اور صلاحیت امن اور آشتی کی ایک فضا پیدا ہوتی ہے۔ پس قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مخاطب کر کے اور پہلے مسلمان کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ انسانی حقوق قائم کر دیئے گئے۔ انسان اپنے حقوق کے دائرہ کے اندر رہ کر فساد کے حالات سے بچے اور اصلاح کے حالات پیدا کرے کیونکہ حق سے تجاوز کرنا ہر دو معنی میں جیسا کہ مَیں نے پہلے بتایا ہے فساد کے حالات کے پیدا کرنے کے مترادف ہے۔

پھر فرمایا تم دعائیں کرو اور بہت دعائیں کرو کہ تم خدا تعالیٰ کی ناراضگی کو مول لینے والے نہ بن جاؤ۔ خَوْفًا اس سے کہ اللہ تعالیٰ کہیں ناراض نہ ہو جائے، حقوق کے دائرہ کے اندر اپنے اعمال کو رکھو یعنی اپنے حق سے زیادہ نہ مانگو اور نہ لو۔ کسی اَور کی حق تلفی کرنے پر جرأت نہ کرو۔ تمہارے دلوں میں یہ خوف پیدا ہونا چاہیئے کہ اگر ایسا کیا تو پھر اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا اور ہم اس کی جنت کو نہیں پا سکیں گے اور طَمَعًا اس امید پر، اس طمع سے کہ اگر ہم شرائط کے ساتھ عمل کریں گے تو محسن ہونے کی صورت میں اُس کی رحمت پائیں گے۔ دراصل مُحسِنٌ کے معنی ہیں تمام شرائط کے ساتھ حُسنِ عمل کرنے والا۔ صرف عمل کرنے والا

نہیں بلکہ شرائط کے ساتھ جو عمل ہو گا وہ حسنِ عمل بن جائے گا۔ غرض جو شخص تمام شرائط پُوری کرتے ہوئے حُسنِ عمل بجالانے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو قریب پائے گا۔ جو شخص دُکھ کے مقابلہ میں دوسروں کے لئے سُکھ کے سامان پیدا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا بڑا پیار حاصل کرتا ہے۔

بعض دفعہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ جی! لوگوں نے ہمیں بڑا دُکھ پہنچایا ہے اس لئے اس کا بدلہ (اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق) ہم لے لیں تو کیا کوئی حرج تو نہیں؟ مَیں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ دیکھو! قرآن کریم نے بدلہ لینے کے لئے بھی اصول وضع کئے ہیں اور اس کے لئے بھی احکام جاری کئے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ تم اپنی مرضی سے جس قسم کا بدلہ لینا چاہو وہ لے لو۔ مثلاً قرآن کریم نے ایک بڑا حسین اصول یہ وضع کیا ہے کہ بدلہ لینے کا اصل مقصد اصلاح ہونی چاہیئے۔ اگر کسی کو معاف کرنے سے اصلاح ہوتی ہے تو بدلہ لینے کا تمہیں حکم ہی نہیں۔ نہ قانون شکنی کی تمہیں اجازت ہے۔ اس کی بڑی لمبی تفصیل ہے۔ مَیں اصولاً یہ بتا رہا ہوں کہ خود بدلہ لینے کے قوانین وضع نہیں کرنے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ بدلہ اِس رنگ میں نہ لو کہ حق سے تجاوز کر جاؤ۔ تم کسی سے اِس رنگ میں بدلہ نہ لو کہ جس نے تم پر ظلم کیا مقابلہ میں بدلہ لیتے وقت تم نے بھی ظلم کر دیا اور اس کی حق تلفی کر دی۔ خدا نے اس کی اجازت نہیں دی۔ تم بدلہ لیتے وقت یہ خیال رکھو کہ اگر اس کی اصلاح کی اُمید ہو تو اپنا حق چھوڑ کر بھی اُس شخص کی اصلاح کی کوشش کرو۔ تم کسی کی خوشی اور سُکھ کے لئے اپنے حق کی قربانی دے دو۔

پس ہمیں قرآن کی ہدایات پر ہر وقت غور کرتے رہنا چاہیئے اور اپنے اعمال کو ان احکام کے مطابق ڈھالنا چاہیئے، یہی انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے کہ خدا تعالیٰ کا پیار اور اس کی رضا حاصل ہو۔ اس کے لئے اِس چھوٹی سی زندگی میں ہر قسم کی تکلیف اُٹھا کر اور ہر قسم کی قربانی دے کر اعمالِ صالحہ بجالانے کی کوشش کرنی چاہیئے تا کہ وہ زندگی جو نہ ختم ہونے والی زندگی ہے اُس میں ہمیشہ کے لئے خوشی اور مسرّتوں کے سامان میسّر آ جائیں خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۵؍اپریل ۱۹۷۵ء صفحہ ۲ تا ۶)

❀❀❀